بین الاقوامی امور میں دوبارہ فعال کردار:

کہتے ہی کہ انگلستان کی حکومت میں وزیرِاعظم کا عہدہ یوں معرضِ وجود میں آیا کہ بادشاہِ وقت جارج اول جرمن شہزادہ ہونے کی وجہ سے انگریزی زبان نہیں بول سکتا تھا۔ اِس لیے اپنے وزراء میں سے بزرگ ترین وزیر رابرٹ والپول کو اپنی کابینہ کے اِجلاس کی صدارت کرنے کا اختیار دے دیا۔ شاید کسی حد تک اِسی طرح کے حالات ہمارے ہاں بن گئے۔ تب ہی تو پورے اٹھارہ سال بعد ہمارے چیرمین صاحب اپنے نائب کی حیثیت سے ہمیں اپنے ساتھ اپریل ۲۰۰۱ء میں ہونیوالی عالمی تنظیم ڈاک کی مشاورتی کونسل کے اجلاس میں شرکت کی خاطر لے گئے اور پھر یہ سلسلہ آئندہ چار برس تک ایسے ہی چلتا رہا۔ سال میں کم از کم دو مرتبہ سوئٹزرلینڈ کی یاترا کرنی پڑتی تھی۔ نامہ بروں کی عالمی تنظیم یونیورسل پوسٹل یونین کی مشاورتی کونسل کا اِجلاس ہر سال اپریل یا مئی کے مہینے میں اور اِنتظامی کونسل اکتوبر۔نومبر میں اپنا اجلاس منعقد کرتی تھی۔

ایک اہم رابطہ کمیٹی کی صدارت:

گذشتہ برس ہونیوالی پانچ سالہ کانگریس میں چونکہ پاکستان کو یو۔پی۔یو [۱] اور آئیاٹا [۲] کی رابطہ کمیٹی کی صدارت مِل چکی تھی لہٰذا ہم نے یو۔پی۔یو کے صدر دفتر پہنچتے ہی اِس کمیٹی کی صدارت سنبھال لی۔ اِتفاق سے اِس بار کئی دقیق امور کمیٹی کے ایجنڈے پر تھے لہٰذا بین الاقوامی ہوائی کمپنیوں کی جانب سے کوئی آدھ درجن نمائندے اجلاس میں شریک تھے۔ ہم نے ایجنڈے پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اِفتتاحی اجلاس ہی میں ڈاک اور ایرلائنز دونوں طرف کے نمائندوں کو بتادیا کہ ہماری نظر سے اٹھارہ۔بیس سال پہلے اِن میں سے اکثر موضوعات گذر چکے ہیں۔ ہم اِن کی نوعیت سے پوری طرح آگاہ ہیں اور اپنے پُرانے تجربے سے اجلاس کو مُستفید کرنے کی پوزیشن میں ہیں اور اِنشاءاللہ اب کی بار اِن سب مسائل کا ہم مِل کر حل نکال لیں گے۔ ایک ہوائی کمپنی کے بُزرگ مندوب نے ہم سے اِتفاق کیا کہ مسائل کی نوعیت تو وہی ہے صرف نئے حالات میں اِنکی نئی پود نے تشریح بدل کر رکھ دی ہے۔ خُدا کے فضل سے اگلی کانگریس کے انعقاد سے قبل ہی ہم نے باہم

---

۱ یونیورسل پوسٹل یونین (UPU)

۲ انٹرنیشنل ائرٹرانسپورٹیشن ایجنسی (IATA)

رضامندی سے اچھے خاصے پیچیدہ مسائل کا حل نکال ہی لیا۔

اِن مسائل میں ایک تو ایک سو نوے ممالک کی ڈاک اِنتظامیہ اور بے شمار ہوائی کمپنیوں کے درمیان ایک مُشترکہ لائحہ عمل پر مَبنی معاہدہ یا ''ماڈل ایگریمنٹ'' تیار کرنا تھا۔ اب بین الاقوامی سطح پر بھانت بھانت کے خیالات کی موجودگی میں ''جتنے مُنہ اتنی باتیں'' ناگزیر ہوتی ہیں۔ پھر طرفین کا تعلق سوداگر اور گاہک جیسا ہونیکی وجہ سے ایک فریق کا مفاد دوسرے کے مفاد سے مُتصادم تو ہوتا ہی ہے۔ اِس کے علاوہ ہر مُلک اور ہر ہوائی اڈے اور وہاں کے کسٹمز کے قوانین اور حساب کتاب کے طور طریقے میں بھی فرق ہوتا ہے۔ لیکن بالآخر اِن سب مُشکلات پر نہ صرف قابو پالیا گیا بلکہ ڈاک اور اُسکے کسٹمرز کے مفاد میں باربرداری یا ٹرانسپورٹ کے چارجز کو ہم پُرانی سطح پر برقرار رہنے میں کامیاب رہے۔ اِسی دوران مختلف ممالک میں عموماً اور امریکہ میں تو خصوصاً عالمی دہشت گردی کے بہت بڑے واقعات ہوئے۔ لہٰذا اکثر ہوائی کمپنیوں نے اپنے حِفاظتی اخراجات بے تحاشا بڑھ جانے کی بنا پر ایک اور خصوصی سرچارج لگانے کی کوشش کی۔ ہم نے اِن کی یہ بات یہ کہہ کر چلنے نہیں دی کہ حفاظتی اِخراجات تو بہرصورت پہلے ہی طے شُدہ فارمولے میں شامل تھے اور اِسے مزید قطعاً بڑھایا نہیں جاسکتا۔ یوں پوسٹ اور اِسکے کسٹمرز عوام کے مفاد کا بھرپور دفاع کرنے میں ہم پوری طرح کامیاب رہے۔ اِس سلسلے میں اِس کمیٹی کے دوسرے مندوبین کا بھرپور تعاون ہمیں حاصل رہا۔ اور کمیٹی کے انٹرنیشنل بیورو سے تعلق رکھنے والے سیکرٹری آکیلاش ماتُر کی مسحورکُن مسکراہٹیں ہماری ہمتیں بڑھانے کے لیے مُمد ومعاون رہیں۔

پَوَن چکیّوں کی سرزمین:

مشاورتی کونسل کے اِجلاس میں کافی کا وقفہ ہوا۔ اُدھر سب مَندوبین چھوٹے بچوں کی طرح ''کافی لاؤنج'' میں پڑی میزوں پر ٹوٹ پڑے۔ ''ارے یہ کیا؟'' ہم نے گویا اپنے آپ سے سوال کیا۔ ''آج بڑے مزے کی سوئس چاکلیٹس آئی ہیں۔ آپ بھی چکھ لیں'' کافی بنانے والی بوڑھی مُحترمہ بولیں جِسے ہم اٹھارہ سال پہلے بھی یہی کام کرتے دیکھ چُکے تھے۔ فرق بس اِتنا تھا کہ اب اُسکے کُشادہ چہرے کی جُھریاں مزید گہری نظر آرہی تھیں اور سر پر گھونگھریالے بال مزید خاکستری رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اِتنے میں آغا مسعود صاحب ایک طویل قامت داڑھی والے حضرت کے ہمراہ ہماری طرف بڑھے اور اپنے ساتھی کا تعارف کرانے لگے۔ ''یہ جان ماَس ہیں۔ نیدرلینڈ پوسٹ کے تعلیم و تربیت کے مشاورتی اِدارے کے ڈائریکٹر''۔ ''آپ سے مل کر خوشی ہوئی'' ہم بولے۔ ''آپ کو یہ سُن کر مزید خوشی ہوگی

کہ جان ہمیں کل ایمسٹرڈم جانے کو کہہ رہے ہیں''۔ آغا صاحب فرمانے لگے۔''واقعی ہمیں ہَوا سے چلنے والی بڑی بڑی چکیوں اور رنگ برنگے آبی نرگس کے پھولوں (ڈیفوڈلز) کی لمبی قطاروں والے کھیتوں کی سرزمین کو دیکھ کر حقیقی خوشی ہوگی''۔ ہم نے جان ماَس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''تو بہت خوب۔ صبح سویرے نو بجے آپ دونوں کو اپنے ہوائی ٹکٹ بر لیب ایئرپورٹ کے کاؤنٹر سے مل جائیں گے۔ میں تو آج شام ہی اپنے مُلک جا رہا ہوں'' جان بولا۔

''بر لیب''، سوئس دارالحکومت بَرن کے مُضافات میں واقع چھوٹا سا اور مقابلتاً خوابیدہ سا ہوائی اڈہ ہے جہاں سے صرف اندرونِ مُلک پروازیں چلتی ہیں یا وہاں وارد ہوتی ہیں۔ کچھ تو صبح کا وقت اور پھر اِختتامِ ہفتہ سنیچر کا دن۔ ہمارے دوست بِلال خان جو اَب عرصے سے عالمی تنظیمِ ڈاک کے صدر دفتر سے وابستہ تھے، ہمیں اپنی کار میں بٹھا کر ہوائی اڈے پہنچے تو آگے سے مُکمل ہُو کا عالم۔ نہ آدم نہ آدم زاد! ''یہ کاؤنٹر تو شاید بند ہے۔ چلئے اُس دوسرے پر جا کر معلوم کرتے ہیں''۔ بِلال بولے۔ وہ آگے اور ہم پیچھے۔ تھوڑا سا آگے چل کر ایک مُختصر سے چھپر نُما عمارت میں جھانک کر دیکھا۔ ایک بوڑھے میاں نظر آئے تو اُس سے پوچھا۔''ہمارے ٹکٹ کہاں سے ملیں گے۔ ہم نیدر لینڈ پوسٹ کے مہمان ہیں''۔ بوڑھے میاں اپنی چھوٹی سی کوٹھری کے اندر گئے اور کھڑکی سے آغا صاحب اور میرے نام کے دو ٹکٹ ہمیں تھما کر فرمانے لگے۔''آپ اندر ہال میں چلئے۔ تھوڑی دیر میں آپ کی پرواز جانے والی ہے''۔

لیجیے ہم سوئس ایئر کے جہاز پر تھے اور اِس انتہائی مُختصر سے ہوائی اڈے سے آسمان کی بُلندیوں کی جانب اُڑنے لگے تھے۔ کوئی چالیس مِنٹ بعد ہمیں ''باسِل'' کے ہوائی اڈے پر اُترنے کو کہا گیا۔ ''باسِل'' سوئٹزرلینڈ کا غالبًا تیسرا بڑا شہر ہے۔ یہاں سے اب ہمارا جہاز بین الاقوامی سفر پر محوِ پرواز ہوا۔ اور فرانسیسی اور جرمن علاقے سے ہوتا ہوا نیدر لینڈ کی فِضاؤں میں پہنچا۔ ایمسٹرڈم اُترے تو جان ماس لینے حاضر تھا۔ ہم تھوڑی دیر میں ''ہیگ'' جانے والی کُشادہ شاہراہ پر تھے۔ جان مُحتاط انداز میں گاڑی چلا رہا تھا اور بتا تا جا رہا تھا کہ سڑک پر جا بجا نصب کیمروں نے ڈرائیونگ مُشکل بنا دی ہے۔ معمولی سی غلطی اِن پوشیدہ آنکھوں سے مخفی نہیں رہتی۔

''ہیگ''، جسے انگریز ''دی ہیگ'' کہتا ہے نہ صرف نیدر لینڈ کا دارالحکومت ہے بلکہ اِس کی ایک وجہ شُہرت یہاں پر کام کرنے والی بین الاقوامی عدالت اِنصاف کی موجودگی ہے جو اقوامِ مُتحدہ کے ادارے کا ایک اہم ستون شُمار کیا جاتا ہے۔ ویسے نیدر لینڈ کے بھی کئی دوسرے نام ہیں۔ انگریز اِسے ''ہالینڈ'' پُکارتے ہیں تو

فرانسیسی اِسے ''پے با'' کہتے ہیں اور مشہور یہ ہے کہ یہ علاقہ سطح زمین سے نیچے واقع ہے۔ نہ بھی ہو تو بھی اِس کا خاطر خواہ حِصّہ سمندر کے پانیوں سے واگذار کیا گیا ہے۔ یہ اگر چہ ایک مُکمل جمہوری مُلک ہے لیکن یہاں کی مَلکہ مُلک کی آئینی سربراہ ہیں۔ اور مَلکہ جولیانہ تو اپنی سائیکل سواری کے لئے جہان بھر میں مشہور اور اپنے مُلک میں ہر دِلعزیز تھیں۔ یوں تو ہالینڈ اپنی ڈیری مصنوعات کے وجہ سے بھی شُہرت رکھتا ہے لیکن اِس کی دولت کی فراوانی کئی لحاظ سے ہے۔ دُنیا بھر کے ترقی پذیر ملکوں کی اِمداد اِس چھوٹے سے مُلک نے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ اور وہاں کے طالب علموں کی تعلیم و تربیت کے لیے تو اِس نے خاص فنڈ مُختص کر رکھے ہیں۔

ماضی میں وَلندیزی ملاحوں نے کئی نئے جزائز اور بحری راستے دریافت کئے اور نئی آباد کاریاں کیں۔ آج کا اِنڈونیشیا ایک عرصے تک جزائر شرق الہند کی مقبوضات کی حیثیت سے ولندیزی تاج کا حِصّہ رہا ہے۔ ہماری عالمی تنظیم ڈاک اور کئی دوسرے عالمی اِداروں میں ہالینڈ کو دو عدد ووٹ اِستعمال کرنیکا حق حاصل ہے ایک نیدر لینڈ کے نام سے اور دوسرا ولندیزی سمندر پار علاقوں کی طرف سے۔

ہمیں ایمسٹرڈم اور ہیگ کے درمیان واقع دُنیا کی ایک مالدار ترین مخلوق کی بستی میں ایک نہایت آرام دِہ اور پُر لطف مناظر کے دامن میں موجود ایک ہوٹل میں مہمان رکھا گیا۔ اِس ہوٹل کا نام بھی خاصا رومانوی محسوس ہوا۔ اِس کے فرانسیسی الفاظ کا ترجمہ ہماری سمجھ میں کچھ یوں بنتا تھا۔ ''پرندوں کا نشیمن''۔ جان نے قریب ہی واقع ایک وسیع و عریض محل سرا کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے ہمیں بتایا کہ وہ ایک عرب شہزادے کی ملکیت ہے۔ گویا عرب شہزادہ ہمارے دور قریب عزیزوں میں سے ہے۔ یا شاید ایسا ہی دُنیا سمجھتی ہے۔

اگلے روز ہمیں پُر رونق آبادیوں کی سیر کے علاوہ وہاں کا ''مشینی ڈاک چھانٹی مرکز'' دِکھایا گیا اور ساتھ ہالینڈ میں موجود تربیتی نظام کے بارے میں بریفنگ سے نوازا گیا۔ سب کچھ انتہائی متاثر کُن تھا خاص کر بین الاقوامی طلباء کی دیکھ بھال کی اِنچارج جوان سال اور جواں ہمت ''ہالاندا'' کے حُسنِ سلوک کے بارے میں تو سب ہی طالبِ علم رطبُ اللسان تھے۔ لیکن جان ماس کی ہم پر نظرِ کرم شاید ایک اور وجہ سے بھی تھی۔ وہ بیرونی اِمداد حاصل کرنے یا عالمی تنظیمِ ڈاک کے ٹرینِنل ڈیوز کے فنڈ سے اپنا حِصّہ وصول کرنیکی خاطر پراجیکٹ بنانے کے سلسلے میں ہمیں اپنی مشاورتی خدمات پیش کر رہا تھا۔ ترقی یافتہ ممالک اِس اَنداز سے پیش کردہ بیرونی اِمداد کا مُعتد بہ حِصّہ مشاورتی خدمت میں شُمار کر لیتے ہیں۔ لیکن ہمیں اپنے سیانوں نے خوش قسمتی سے اِس جال میں

پھنسنے سے قبل از وقت ہی آگاہ کر دیا تھا۔ لہٰذا ہم نے ایسا پراجیکٹ بنانے پر اپنے ہی بندے لگا دیئے اور خُدا کا کرنا یہ ہوا کہ ہم اِس کوشش میں کامیاب بھی ہوئے۔ کراچی شہر میں تقسیمِ ڈاک کو بہتر بنانے کے لئے 160 موٹر سائیکلیں لینے اور نیٹ ورکنگ کا نظام قائم کرنے کے لئے بارہ ہزار ڈالر کا پراجیکٹ بنایا اور کچھ عرصہ بعد لاہور شہر اور چند دیگر شہروں کے لیے بھی ڈھائی سو کے لگ بھگ موٹر سائیکلیں وغیرہ حاصل کرنے کے لیے 143000 ڈالر کا پراجیکٹ بنایا گیا۔ اور یوں تقریباً نوے ہزار ڈالر کی خطیر رقم بچالی۔

اگلے دن واپسی پر ہم نے ایمسٹرڈم کے تاریخی شہر کی ایک جھلک دیکھی۔ یہاں آئین میں ایمسٹرڈم کا کا ہی بطور دارلحکومت ذِکر ہے۔ ویسے سارے مُلک کے حکومتی دفاتر ''دی ہیگ'' میں واقع ہیں۔ مزے کی بات یہ کہ ایمسٹرڈم نامی صوبے کا بھی یہ شہر صدر مقام نہیں۔ وہ تو ''ہرلیم'' کہلاتا ہے۔ ایمسٹرڈم جِسے اپنے تاریخی نہری نِظام کی وجہ سے ''شمال کا وینس'' بھی کہا جاتا ہے خود ''ایمسٹِل'' نامی دریا پر واقع ہے جہاں صدیوں پہلے وہاں کے بزرگوں نے ایک ڈیم بنایا تھا۔ خاص شہر کی آبادی 751000 نفوس پر مشتمل بتائی جاتی ہے جن کا 175 کے لگ بھگ قومیتوں سے تعلق ہے۔ یہ عظیم تاریخی بندرگاہ آج یورپ کے سب سے پُرانے سٹاک ایکسچینج کو اپنے ہاں سنبھالے ہوئے ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اسے ''سائیکل دوست'' شہر کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے کیونکہ یہی یہاں کے عوام کی پسندیدہ سواری ہے۔ کاریں چلانی ہوں تو ایک بڑی رقم ٹیکس میں جو دینی پڑتی ہے لیکن اِس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں سائیکل چوری بہت عام ہے اور ہر سال ایک لاکھ سائیکلیں چوری ہوتی ہیں۔ عیسائی مذہب کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والوں کی واضح اکثریت ہونے کے باوجود اِس شہر میں مُسلمان آبادی کا دوسرا نمبر ہے جن میں اکثریت سُنّی مسلمان بتائے جاتے ہیں۔ [1]

ایک تاریخ ساز مُہم :۔

۱۹۹۹ء میں بیجنگ میں مُنعقدہ پانچ سالہ کانگریس نے عام خطوط کے علاوہ رجسٹرڈ قطعاتِ ڈاک پر بھی ''ٹرمینل ڈیوز'' کا محصول نافذ کر دیا۔ چھ ممالک بشمولِ بھارت اور سعودی عرب نے ایک ریزرویشن کے ذریعے یہ زائد رقم دوسروں سے وصول کرنا تو منظور کر لیا لیکن اپنے آپ کو اِس سے محفوظ گردانا۔ اِسے یکطرفہ زیادتی ہی قرار دیا جاسکتا تھا۔ اُسی لمحے ۶۴ دوسرے ممالک نے ایک کاؤنٹر ریزرویشن کے ذریعے اِن چھ ممالک کے ساتھ لین دین میں اپنا یہ حق محفوظ رکھا کہ وہ سب ٹرمینل ڈیوز کی یہ زائد رقم اِن ممالک سے لے بھی سکیں گے اور دیتے بھی

[1] وِکی پیڈیا ڈاٹ کام

رہیں گے جیسے کہ بیجنگ کانگریس میں طے پایا تھا۔ بدقسمتی سے پاکستان اور کئی دوسرے ممالک نہ تو پہلی ریزرویشن میں شامل ہوئے اور نہ ہی دوسری میں۔ ایک سال بعد جب متعلقہ مُلکوں نے رجسٹرڈ قطعاتِ ڈاک کے ذیل میں ٹرمینل ڈیوز کی اضافی رقم کا تقاضا کیا۔ تو پتہ چلا کہ پاکستان کو اِس مَد میں سالانہ دو کروڑ روپے دینے پڑیں گے اور یوں پانچ سال میں کم از کم ۱۰ کروڑ ادا کرنے ہونگے جبکہ ہمیں اِس سلسلے میں کچھ ہاتھ نہیں آئیگا۔ ہمارے لیے یہ خاصی بڑی رقم تھی اس صورتِ حال کو جو محض ہمارے بیجنگ جانیوالے وَفد کی غفلت یا ناتجربہ کاری کے باعث پیش آئی، بدلنے کی فوری ضرورت محسوس ہوئی۔ اگلی کانگریس تو پورے پانچ برس بعد منعقد ہونی تھی البتہ عالمی تنظیمِ ڈاک کے قوانین میں یہ گُنجائش موجود ہے کہ اگر کسی طرح سے پوری تنظیم کے نصف تعدادِ ممبران کو اِس سلسلے میں راضی کیا جاسکے کہ وہ بذریعہ ڈاک اپنی رائے دینے پر آمادہ ہو جائیں تو پھر دوسری رائے شماری میں بذریعہ ڈاک ہمارے حق میں ووٹ دے کر اِس غلطی کا مداوا کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اِن میں سے دوتہائی ممبران کے ووٹ ہمارے حق میں ہوں [۱]۔ بین الاقوامی ڈاک کنونشن میں یہ قانون تو موجود ہے لیکن بغیر کانگریس کے اِنعقاد کے اتنی بڑی تعداد میں ممبر ممالک کو رضا مند کرنا انتہائی مشکل کام تھا اور ماضی میں اِس قسم کی رائے شماری میں کامیابی کی کوئی نظیر نہیں تھی۔ لیکن ہم نے قسمت آزمانے کی ٹھانی۔ اور دُنیا بھر کے ممالک سے اس سلسلے میں رابطہ کیا۔

ہماری مُخلصانہ کوشش رنگ لائی۔ ہم مطلوبہ ووٹ لینے میں کامیاب رہے اور یوں پاکستان کا نام ۶۴ دوسرے ممالک کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔ ہماری پیروی کرتے ہوئے دس دیگر ممالک نے بھی کوشش کی۔ سب سے پہلے ''چین'' نے پھر برطانیہ اور اسرائیل نے۔ لیکن اِن میں سے کوئی بھی مُلک مطلوبہ تعداد میں ووٹ نہ لے سکا۔ یہ ایک تاریخی کامیابی تھی جس کا اعلان یونیورسل پوسٹل یونین کے سرکلر نمبر 1345 (DER.PR) 0115 مورخہ ۷ مئی ۲۰۰۲ء کے ذریعے کیا گیا۔ ہمارے حق میں اتنی بڑی تعداد میں ووٹ دے کر اکثریت نے ہمارے اِس موقف کی بھی تائید کی کہ بین الاقوامی معاہدوں میں اِمتیازی سلوک برتنے کی گُنجائش نہیں ہونی چاہیئے۔ لہٰذا اگلی کانگریس مُنعقدہ بُخارسٹ (رومانیہ) میں اِس قسم کی صورتِ حال کا اِزالہ کرنیکے لیے ریزرویشنز کا طریقہ کار ہی تبدیل کر دیا گیا۔

ساواپو [۲] سے یوریشیا: [۳]

جنوبی اور مغربی ایشیا کے تین اِسلامی ممالک نے ۱۹۷۴ء میں کئی باہمی مُشترکہ مُعاملات اور مشترکہ مُفادات کی بنا پر وقت کے چیلنجیز کا مِل کر مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ اِس اِشتراک کو ''ساواپو'' کا نام دیا گیا۔ تُرکی، ایران اور پاکستان اِس کے تین

---

[۱] یونیورسل پوسٹل کنوینشن آرٹیکل 59، پیرا 3.1

[۲] ساؤتھ اینڈ ویسٹ ایشیا پوسٹل یونین۔

[۳] یورپ اور ایشیا کے اُن ممالک کا اشتراک جن کی سرحدیں آپس میں ملتی ہیں۔

بُنیادی رُکن شُمار ہوئے۔ تینوں ممالک بین الاقوامی سطح پر ایک دوسرے کی مَدد پر ہر دم کمر بستہ رہے۔ گاہے گاہے یہ ممالک ڈاک ٹکٹوں کی نمائشیں منعقد کرتے رہے۔ مُشترکہ موضوعات پر نئے ڈاک ٹکٹ جاری کر کے اپنے عوام کی روایات و جذبات کا اظہار بھی کرتے رہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تینوں ممالک نے پورے خِطّے میں یکساں شرح ڈاک پر عوامی خط و کتابت کے لیے آسانیاں مُہیا کیں۔ اِس یونین کا صدر دفتر تہران میں بنایا گیا۔ ۱۹۷۹ء میں ایران میں جب عوامی اِنقلاب نے شہنشاہیت کا خاتمہ کر دیا تو فوری طور پر کچھ عرصہ کے لیے ایران نے سارے بین الاقوامی معاہدوں کو خیر باد کہہ دیا۔ ایران ''سواپو'' کی تنظیم سے نکلا تو اِس کا صدر دفتر تُرکی منتقل کر دیا گیا لیکن اب ''سواپو'' محض دو ممالک کا اتحاد رہ گیا تھا۔ دو سال بعد جب ایران دوبارہ اِس تنظیم کا ممبر بنا تو اس کا صدر دفتر دوبارہ تہران منتقل ہوا اور وہیں سے تنظیم کا معتمدِ عمومی یا سیکرٹری جنرل چُنا گیا لیکن یہ اِنتظام صرف عارضی رکھا گیا اور طے یہ پایا کہ آئندہ سے اِس کا صدر دفتر اور مُعتمد خصوصی ہر دو سال کے بعد دوسرے رُکن مُلک میں منتقل کر دیا جائیگا۔ کچھ ایسا ہی اِنتظام یوروپین اور کچھ دوسری پوسٹل یونینز میں بھی چل رہا تھا۔

سوویٹ یونین ٹوٹا تو اِس میں شامل ایشیائی ممالک جو مرکزی ایشیا میں واقع تھے، نے بھی ہماری علاقائی یونین میں شمولیت کا عِندیہ دیا بلکہ قازقستان اور آذر بائیجان تو باقاعدہ طور پر اِس کے ممبر بھی بن گئے۔ جن دِنوں اِس تنظیم کا مرکز انقرہ (جمہوریہ تُرکی) ٹھہرا تو جمہوریہ قبرص سے جُدا ہونیوالا علاقہ ''تُرک آبادی پر مُشتمل شمالی قبرص'' کو بھی اِس کا رُکن بنا دیا گیا۔ ایران اِس پر مُعترِض ہوا اور ساتھ ہی حسب وعدہ تنظیم کو دوبارہ تُرکیہ کی نِگرانی میں دینے سے اِنکار کر دیا۔ لہٰذا تہران میں ہونے والی تنظیم کی پانچ سالہ کانگرس کے موقع پر تُرکی اور ایران کے اِختلافات اُبھر کر سامنے آ گئے۔ اُدھر سابقہ سوویٹ علاقوں کے نو آزاد ممالک نے آر۔ سی۔ سی [1] یا ''روسی دولتِ مُشترکہ'' کے نام سے اپنی ایک علیحدہ تنظیم بنا دی۔ تُرکی نے بھی ''سواپو'' چھوڑ دیا اور اپنے طور پر ایک اور تنظیم ''یوریشیا'' کے نام سے بَنا ڈالی اور پاکستان کو بھی اِس میں شمولیت کی دعوت دیدی۔ اپنے دفترِ خارجہ کے مَشورے سے ہم نے بھی ''یوریشیا'' میں شمولیت اختیار کر لی۔

پاک۔ تُرک دوستی اور یوریشیا:۔

جون ۲۰۰۱ء میں ہمارے تُرک دوست اور تُرک پوسٹ کے پریذیڈنٹ نجدت آکوش کی کوششوں کا حاصل۔ ''یوریشیا پوسٹل یونین'' کا پہلا اِجلاس یورپ اور ایشیا کے سنگم پر واقع تاریخی شہر اِستنبول میں مُنعقد ہوا تو اِس میں تُرکی کے علاوہ جارجیا۔ مقدونیہ۔ آذر بائی جان۔ تُرک قبرص۔ قازقستان اور پاکستان سے آئے ہوئے مندوبین شریک ہوئے۔ ہماری حیرت کی اُس وقت اِنتہا نہ رہی جب ہم نے سب ہی مندوبین کو مِل بیٹھ کر ایک دوسرے سے تُرکی زبان میں گفتگو کرتے ہوئے پایا' ماسِوا ہم پاکستانی شرکاء کے جن کی قومی زبان کا نام نامی ''اُردو'' تو ضرور تُرک زبان سے مُستعار لیا ہوا لفظ تھا لیکن ہماری ترک ناشناسی کے باعث محض ہمارے لیے انگریزی زبان میں ترجمانی کا اِنتظام کیا جاتا تھا۔ اُدھر تُرک دوستی پر ہم پاکستانیوں کو بڑا ناز بھی تھا۔ اور ہمارے ترک میزبان بھی اُن کی خالص ترک محفلوں میں ہماری شرکت پر اِنتہائی ممنون تھے۔

[1] ریجنل کامن ویلتھ کنٹریز

اِس صورتِ حال پر جنرل آغا مسعود اور ہم دِل ہی دِل میں فارسی دانشوروں کا یہ مقولہ دہراتے جاتے تھے کہ

زبانِ یارِ من تُرکی وَمَن تُرکی نمی دانم

اِس اجلاس میں یونیورسل پوسٹل یونین، یورپین پوسٹل یونین اور فرانس کے مندوبین نے بھی شرکت کی اور مختلف امور پر مقالے پڑھ کر ہماری معلومات میں اِضافہ کیا۔ تُرک پی۔ٹی۔ٹی کے سربراہ شاہین ابراہیم نے دوسرے اِجلاس کی صدارت فرمائی۔ شاہین صاحب سیاسی آدمی تھے اور پی۔ٹی۔ٹی کی باگ دوڑ سنبھالنے سے قبل وہ شہر استنبول کے ڈپٹی میئر رہ چکے تھے آغا صاحب سے اُنکی خوب دوستی رہی۔ ویسے تُرک اچھے اور مُخلص دوست ہونے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

اِس نئی علاقائی تنظیم کے خدوخال اِس کے آئین بناتے وقت وضع کر دیئے گئے اور پھر شریک ممالک کے نامہ بری کے شعبے میں بہتری لانے کے لیے کئی امور پر اِتفاق ہوا۔ اگلے سال کا اِجلاس آذربائی جان کے شہر ''باکو'' میں مُنعقد ہونے کا فیصلہ ہوا۔ بدقسمتی سے کسی وجہ سے آذربائی جان دوسرے اِجلاس کی میزبانی کے فرائض انجام نہ دے سکا تو یہ دوسرا اِجلاس بھی جولائی ۲۰۰۳ء میں جمہوریہ ترکی کے زیرِ سرپرستی اِستنبول میں ہی مُنعقد ہوا۔ البتہ تیسرا اِجلاس فروری ۲۰۰۴ء میں ہمارے ہاں اِسلام آباد میں بُلانے پر اِتفاق ہوا۔

آبنائے باسفورس کے آر پار:۔

اِن دو مواقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہمیں تاریخ وجُغرافیہ ساز شہر اِستنبول کو اچھی طرح اور قریب سے دیکھنے کا موقع مِلا۔ یہ شہر مختلف تہذیبوں اور مختلف بادشاہتوں کا مرکز رہا ہے لیکن آج بھی یہ جیتا جاگتا شہر ہے۔ جہاں بیک وقت دو عظیم براعظموں کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ بے شمار عجائب گھروں کا شہر بھی ہے اور شاندار تاریخی رازوں کا امین بھی۔ آبنائے باسفورس بحیرۂ اَسوَد اور مارمورا کے پانیوں کو مِلاتا ہے تو ''خلیج'' یا ''گولڈن ہارن'' یورپی سمت پر واقع قُدرتی بندرگاہ ہے۔ اور اِستنبول باسفورس بوغازی کی سیر تو یورپ اور ایشیا کے ساحلوں کو ایک ہی نظر میں دیکھنے کا ایک ناقابلِ فراموش موقع فراہم کرتا ہے۔

ہمیں سب سے پہلے حِصار رومیلی کو دیکھنے کا موقع مِلا جو ۱۴۵۲ء میں اُس وقت کی بازنطینی مملکت کے دارالخلافہ قسطنطینہ کے ترک سُلطان محمد فاتح کے ہاتھوں فتح کا موجِب بنا۔ یہ قِلعہ آبنائے باسفورس پر ایسی جگہ واقع ہے کہ جہاں سے گذرنے والے بحری جہازوں کو روکنے۔ اُنکا معائنہ کرنے اور اُن سے مَحصول وصول کرنے کے لیے بہترین رکاوٹ کھڑی کی جاسکتی ہے۔ یہ صورتِ حال آج بھی بعینہ ویسی ہی ہے۔ اِس عظیم مسلمان بادشاہ کے حُکم سے بننے والے اس قلعے کو صرف چار ماہ کے قلیل عرصے میں تعمیر کیا گیا تھا اور یہ آج تک فوجی طرزِ تعمیر کی ایک انوکھی مِثال سمجھا جاتا ہے۔ اِس تاریخی قلعے کی دیوار سے لگ کر آج بھی کھڑے ہوئے اِنسان کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اُس نے یورپ کی شہ رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ تقریباً ہر دو منٹ بعد کسی نہ کسی مُلک کا پرچم لہرائے کوئی نہ کوئی بحری جہاز اِن پانیوں کو چیرتا ہوا گزرتا اور حکومتِ تُرکی کے خزانے میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔

ایک روز تو ایک بجرے میں بیٹھ کر ہم نے یورپی ساحل پر واقع ''شہزادوں کے جزیرے'' کی سیر کی جہاں بگھیوں میں بیٹھ کر سیاح سڑک کے دونوں کناروں پر واقع قدیم محلات اور قلعوں کو دیکھتے ہوئے ماضی کے رومانوی خیالات میں آپ ہی آپ کھو جاتا ہے۔ اِس جزیرہ پر یہودی آبادی کے نشانات آج بھی نمایاں ہیں اور یونانی تہذیب کے مظاہر بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اِس قسم کے کئی چھوٹے چھوٹے جزائر اپنے نایاب اَشجار اور پودوں کے ساتھ سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ عثمانی دور میں جہان بھر سے نایاب پودے لا لا کر یہاں لگائے گئے تھے جن کے طبی اجزاء یہاں کے شفاخانوں میں کام آتے تھے۔ آبنائے کے دوسری جانب ''توپ کاپی'' میوزیم واقع ہے جہاں پندرھویں صدری سے اُنیسویں صدی تک کے عُثمانی سلاطین کی رہائش گاہیں آج بھی ماضی کی آب وتاب لئے اِیستادہ ہیں۔ جہاں کے دربار۔ لائبریریاں اور اَنمول تاریخی نوادرات کے خزانے ہر دیدۂ بینا کو دعوتِ دید دیتے ہیں۔ اِسلامی دور کے نوادِرات مُقدسہ میں نبی کریم ﷺ اور اُنکے نواسوں کی پگڑیاں۔ جوتے اور عصا سب ہی موجود ہیں۔ اِس حصّے میں متواتر ایک کونے سے ایک اِنتہائی خوش الحان قاری کی کلامِ پاک کی قرأت باعثِ تسکین روح بنتی ہے۔ یہودی رعایا سے حاصل کردہ کچھ قدیم نوادرات کو دیکھ کر اِنسان ماضی کے دُھندلکوں میں کھو سا جاتا ہے۔ یہیں پر مشہورِ زمانہ عصائے موسوی بتائی جاتی ہے اور کچھ ایسی ہی چیزوں کا تعلق حضرت داؤدؑ اور ابوالانبیا حضرت اِبراہیم خلیل اللہ سے بتایا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

''گولڈن ہارن'' بازنطینی اور عُثمانی عہد کی تاریخ سمیٹے ہوئے ہے۔ تو پانچویں صدی میں شہنشاہ تھیوڈوسس دوم کے حُکم سے تعمیر کردہ اِستنبول کی فصیلیں آج بھی ''یونیسکو'' کی میراثِ انسانیت کی محفوظ کردہ عمارات کی فہرست میں شامل ہیں۔ ہمیں مسجدِ سُلیمانِ اعظم دیکھنے کے ساتھ ساتھ مسجدِ سلطان احمد اوّل کے نیلے در و دیوار مُلاحظہ کرنیکا بھی موقع مِلا۔ آخرالذِکر کو عموماً ''بلیو ماسک'' کہا جاتا ہے۔ دونوں کے پہلو میں شفاخانے، محتاج گھر، مدرسے اور غرباء کے کھانے کے لیے باورچی خانے، کاروان سرائے اور حمام موجود ہیں۔ جو اُن سلاطین کی اپنی رعایا کی دیکھ بھال میں دلچسپی کی نشانِ دہی کرتے ہیں۔ مُلحقہ سلطان احمد چوک بازنطینی دور میں رَتھوں کی دوڑ کا میدان ہوا کرتا تھا۔ یہاں شہنشاہ کانسٹینٹین اور تھیوڈوسس کی یادگاریں آج بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

اِستانبول کے بیشُمار محلات میں خصوصی توجہ کا مرکز ''ڈولام باشے'' محل ہے جہاں سلطان عبدالمجید کا حرم ہر کسی کو دِکھایا جاتا ہے۔ جہاں کی بالکونیوں سے حَرم کے باسی اِنتہائی باپردہ حالت میں نیچے واقع دربار ہال کی ساری کاروائی مُلاحظہ کر سکتے تھے۔ اور مختلف مقبوضات سے آنے والے وفود کی خلیفۂ وقت کے حضور میں پیشی کے سارے مناظر یقین کی آنکھ سے دیکھ سکتے تھے۔ رفتارِ وقت کبھی رُکی نہیں۔ عُثمانی دور کا خاتمہ ہوا۔ ترکی اب ایک عظیم طاقت نہیں رہی تو نوجوانانِ ترک کے قائدین نے اتا ترک غازی مصطفٰے کمال کی سرکردگی میں ترک جمہوریہ کی داغ بیل ڈالی۔ بابائے جدید ترکی نے اپنے آخری ایّام اِسی عظیم محل کے ایک حِصّے میں گذارے اور یہیں اپنی سوگوار قوم کو ایک دن داغِ مُفارقت دے گئے۔

اِستنبول نہ صرف جدید اور قدیم کا اِمتزاج ہے بلکہ جدیدیت و قدامت پرستی دونوں کا مظہر بھی۔ ویسے ترک قوم تقریباً آدھو آدھ سیکولر نظریات اور مذہبی رسومات سے مُحبت کرنے والوں میں مُنقسِم دکھائی دیتی ہے۔ ہم نے فاتح قسطنطنیہ سلطان محمد اوّل کے مزار

پر حاضری دی۔ ''آیَپ'' کے علاقے میں واقع میزبانِ نبیؐ اور علمبردارِ رسولؐ حضرت ابوایوب انصاریؓ کی مسجد میں نمازِ جُمعہ پڑھی۔ ترکوں کا مذہبی جوش وولولہ دیکھا۔ ایا صوفیہ میوزیم کو ہر پہلو سے نشانِ عبرت پایا۔ ترک پی ٹی ٹی کے زیرِ انتظام چلنے والے بڑے اور جدید ہسپتال کی سہولیات دیکھیں اور اُس کے پہلو میں واقع خانۂ بُزرگان بھی دیکھا جہاں ترک پوسٹ اور ٹیلی گراف نے اپنے بُزرگ سابق کارپردازن کو اپنے آخری ایّام میں علاج ومعالجے کی سہولیات فراہم کرنے کی غرض سے رکھا ہوا ہے۔ اِن بزرگوں کو دیکھ کر اپنے مُستقبل کے مُتعلق فکر مندی اور اندیشہ ہائے فرداکے جذبات کا سامنا کرنا پڑا۔ کاش ہمارے ہاں بھی ایسی سہولتیں دستیاب ہوسکیں تاکہ بُزرگ اور معذور سابقہ مُلازمینِ ڈاک کو محض اُنکے اپنے مصائب میں مُبتلا اَولاد کے رحم وکرم پر نہ چھوڑا جائے۔

ہمارے میزبانوں نے پہلے اِجلاس کے اختتام پر ہماری تفنُّنِ طبع کی خاطر ایک مے خانے میں شام کی ضیافت کے ساتھ ساتھ رقص وموسیقی کا انتظام کر رکھا تھا۔ ہال میں جو مختلف ممالک سے آئے ہوئے سیاحوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، ہر جانب سے بھانت بھانت کی بولیاں سُنائی دے رہی تھیں اور ترک موسیقار بھی مختلف بین الاقوامی زبانوں کے گیت سُنا کر سامعین سے داد وصول کر رہے تھے۔ اُن کی زبان سے اُردو الفاظ سُن کر تو واقعی لُطف آیا۔ اگلے اِجلاس تک حکومت بدل چُکی تھی اور اسلام پسند حُکمران اِنتخابات جیت کر آئے تو پی ٹی ٹی کے سربراہ بھی بدل گئے۔

شاہین اِبراہیم صاحب نئے حکمرانوں کے نمائندے کی حیثیت سے مختلف ذہن رکھتے تھے اُنہوں نے ہماری آخری رات کی دعوت کے لیے حُقہ نوشی کے ایک مرکز کا اِنتخاب کیا۔ جہاں شام کے کھانے کے ساتھ ترکی کا مشہور ''نرجل'' بھی پینے کو دستیاب تھا۔ بھینی بھینی خوشبو بکھیرنے والے مُعطّر دھوئیں کا کش لینے کا سمان بلاشبہ یاد رکھنے کی شے تھی۔

ثالِث کا کردار:۔

ہمارے دو دوست ممالک ایران اور ترکی کے راہبران نامہ براں میں علاقائی یونین کے صدر دفتر اور یونین کے معتمدِ خصوصی کے تقرّر کے حوالے سے تنازعہ کی وجہ سے دُوریاں بڑھتی جارہی تھیں۔ ہمارے جولائی ۲۰۰۳ء کے اِستنبول میں قیام کے دوران ترک بھائیوں سے اِس سلسلے میں بات ہوتی رہی۔ آخر یہ طے پایا کہ ہم اور آغا صاحب تہران جا کر ایرانی بھائیوں سے بات کریں۔ اگر وہ ہماری ثالثی کے نتیجے میں کسی حل پر مُتفق ہوئے تو ترک بھائی ہمارا فیصلہ بسَر وچشم تسلیم کرلیں گے۔ لہٰذا ترکی سے واپسی پر ہم دو روز کے لیے تہران ٹھہرے جہان ایرانی حُکام نے ہمیں ہوٹل اِستقلال میں ٹھہرایا جہاں ہم ایک مرتبہ پہلے بھی قیام کر چُکے تھے۔ ایرانی حُکام سے اُنکے ایران پوسٹ کے صدر دفتر میں گفت وشنید ہوئی۔ ہم نے انہیں ترک پوسٹ کے موقف سے آگاہ کیا۔ جواباً ایرانی دوستوں نے ترک اہل کاروں سے متعلق اپنے تحفظات سے آگاہ کیا اور اِس بات پر زور دیا کہ ۱۹۷۴ء سے موجود ایک معاہدے سے روگردانی کرتے ہوئے تُرکوں نے اپنی علاقائی تنظیم ''سوایو'' کو خیر باد کہہ کر ایک بالکل ہی نئی تنظیم

کیسے بنا ڈالی ہے؟ ہم نے اُنہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ ترکوں کے نزدیک قبرص کا مسئلہ موت وزیست کا مسئلہ ہے۔ ایران اور پاکستان کو یونان سے اچھے تعلقات برقرار رکھتے ہوئے ترکوں کی بھی دل شکنی نہیں کرنی چاہیئے چونکہ وہ کسی صورت میں قبرص میں آباد تُرک اقلیت کو ظالم یونانی اکثریت کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔ پھر ایران نے اپنی علاقائی تنظیم کا صدر دفتر اپنے ہاں برسہا برس تک رکھ کر اس تنظیم کے سلسلے میں اپنا کردار ادا کرلیا ہے۔ اب یہ کام اُنہیں دوسرے اراکینِ یونین کو حوالہ کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ دراصل ایرانی سیکریٹریٹ کے کام سے کوئی بھی فریق مکمل طور پر مطمئن نہیں تھا۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ اگلے برس ۲۰۰۴ء میں ''یوریشیا تنظیم'' کا سالانہ اجلاس اسلام آباد میں ہوگا۔ ایران اُس میں شرکت کریگا اور پھر میزبان مُلک پاکستان کے توسط سے ایرانی اور ترک حُکام آپس میں ملاقات کرکے اور اپنے گِلے شکوے سُنا کر کوئی نہ کوئی حل نکال سکیں گے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اگست ۲۰۰۴ء میں ''یوریشیا'' کا تیسرا اجلاس اسلام آباد میں مُنعقد ہوا تو اِس میں ترکی، آذربائی جان، شمالی قبرص (ٹرکش فیڈریٹیڈری پبلک آف نارتھرن سائپرس) اور پاکستان کے علاوہ ایران اور افغانستان کے نمائندے بھی شریک ہوئے۔ یہیں پر پاکستان کے اِصرار پر ترکی کے بخدت آکوش نے ''سواپو'' کے پچھلے کئی برس سے معرضِ اِلتوا میں پڑی ہوئی کارروائی پر ترکی کی جانب سے دستخط ثبت کردیئے۔ یوں فی الوقت دونوں فریق کچھ حدتک مطمئن ہوگئے۔ یہ اور بات ہے کہ اِس کے بعد حالات اور وقت کے تقاضے بدل گئے یا خُدا جانے اِسلامی دُنیا کو کِسی کی نظر لگ گئی۔ یہاں ہم اپنی اُس کوشش کا ذِکر کرنا چاہیں گے جو ہم نے یوریشیا کو عالمی تنظیمِ ڈاک (یو۔پی۔یو) سے تسلیم کرانے کے حوالے سے کی۔ بدقسمتی سے اِس کوشش میں ہم کامیاب نہ ہوسکے۔ دراصل اُن دِنوں امریکہ سے تعلق رکھنے والے جانِ لیوی عالمی تنظیمِ ڈاک کے سربراہ تھے۔ یوریشیا کے ترک معتمد خصوصی کے ہمراہ ہم نے جب اُن سے اِس سلسلے میں ملاقات کی تو مسٹر لیوی نے یہ موقف اِختیار کیا کہ عالمی طاقتوں کے دباؤ کے تحت اقوامِ مُتحدہ چونکہ ترک قبرص کو ایک آزاد مُلک تسلیم ہی نہیں کرتا لہٰذا ایسی کسی بھی تنظیم کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا جسمیں ترک قبرص بطور رُکن شامل ہو۔ اِس سلسلے میں ہم اپنے ترک بھائیوں کو یہ مشورہ دیتے رہے کہ ایسی صورتِ حال کے پیشِ نظر ترک قبرص کو مکمل رُکن بنانے کی بجائے محض ایک مُبصّر کی حیثیت دی جائے یا پھر ترکی قبرصی نمائندوں کو جمہوریہ ترکی کے وفد میں شامل ارکان کی حیثیت سے ''یوریشیا'' اور دیگر بین الاقوامی جلسوں میں شرکت کرنے دیا جائے۔ لیکن ترکی شمالی قبرص کی مُکمل رُکنیت سے کم حیثیت پر کسی صورت راضی ہونے کو تیار نہ تھا۔ اُدھر اُس سال سے حکومتِ پاکستان کی منظوری سے ہم نے غیر فعال ''سواپو'' کی رُکنیت بھی ختم کردی۔

جیمز بانڈ کے نقشِ قدم پر:۔

اپریل ۲۰۰۲ء میں ہم حسبِ معمول عالمی تنظیمِ ڈاک (یو۔پی۔یو) کے مشاورتی کونسل کے سالانہ اِجلاس میں شریک ہوئے تو سوئس پوسٹ تعطیل والے دِن سب شرکاء کو ''شِل تورن'' کی پہاڑیوں پر لے گئی۔ اِس جگہ کی وجہ شہرت یہ تھی کہ یہاں برف

پوش پہاڑوں کی ایک چوٹی پر برف پر پھسلنے والوں کی سہولت کے لیے ایک گھومنے والا ریستوران موجود تھا۔ جہاں سے چاروں طرف کا خوبصورت منظر ملاحظہ کیا جاسکتا تھا۔ صِرف اتنی سی بات نہیں تھی بلکہ مشہور یہ تھا کہ ۱۹۶۰ء کے عَشرے میں بننے والی ہالی وُڈ کی مشہورِ زمانہ جاسوسی فِلم جیمز بانڈ ۰۰۷ یہیں فلمائی گئی تھی۔ جس میں جیمز بانڈ اپنے دُشمنوں کو یہاں تک تلاش کرتا ہے اور پھر اِنتہائی بُلندی پر واقع ہر طرف سے برفانی تودوں میں گھرے ہوئے اِس ریستوران کو ایک خون ریز لڑائی کے دوران مُکمل طور پر تباہ کر دیا جاتا ہے۔ لیکن فِلم کمپنی سے قریب کے گاؤں ''شِل تورن برگ'' کی مقامی حکومت نے یہ طے کر رکھا کہ اِس ریستوران کو تباہی کے بعد مکمل طور پر دوبارہ تعمیر کر دیا جائیگا اور ساتھ ہی گاؤں کی مُتعلقہ سڑک بھی بہترین طریقے سے تعمیر کی جائیگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

سڑک سے ہم لوگوں کو ایک بڑی کیبل کار کے ذریعے بُلندی پر واقع ایک پہاڑی تک پہنچایا گیا۔ پھر وہاں اُتر کر اور تھوڑا سا چل کر پہلے والی کیبل کار سے کہیں بڑے، تاروں پر پھسل کر چلنے والے ایک ہال نُما کمرے کی مدد سے مزید سینکڑوں میٹر بلندی پر لے جایا گیا۔ جِس وقت ہم سب مندوبین دوسری کیبل کار میں سوار ہو چکے اور اُسکے دروازے بند ہو گئے اور ہماری اوپر کے منطقوں کی طرف اُڑان شروع ہوگئی تو ہمیں بتایا گیا کہ ٹھیک بیس برس پہلے بھی عالمی تنظیمِ ڈاک کے اِجلاس شُرکاءِ اجلاس کو یہاں لایا گیا تھا۔ اتفاق سے کِسی وجہ سے یہ کار ہوا میں لٹکتی ہوئی خراب ہوگئی تھی اور پھر اُسی مندوب یوں اڑتالیس گھنٹے تک مُعلق رہے تب جا کر اِمدادی ٹیم نے آ کر صورتِ حال دُرست کی۔ یہ سُننا تھا کہ خواتین اور کچھ کمزور دِل اَصحاب کی تو چیخیں نِکل گئیں۔ بہر حال ہم دونوں جانب سفر کرتے ہوئے کلمے شریف کا وِرد کرتے رہے۔ چوٹی پر پہنچے تو دوسری جانب ایک وسیع برف پر پھسلنے کا میدان تھا جس پر برف کی ایک چادر بچھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ غالباً یوں بلندی پر آکسیجن کی کمی کی وجہ سے پُرتگال کی ایک خاتون مندوب کی حالت غیر ہوگئی۔ ہمارے آغا صاحب نے فوراً اپنی جیب سے اپنے فِشارِ خون کی گولی نکال کر اُسے پیش کر دی اور یوں جنرل صاحب زندگی بخشندہ کے روپ میں نظر آنے لگے۔

تنظیمِ ڈاک کو مالیاتی بُحران سے بچانے کی خاطر قائم کردہ ایک ذیلی کمیٹی کی صدارت:۔

۲۰۰۳ء کی اِنتظامی کونسل کے اِجلاس کو بتایا گیا کہ یونیورسل پوسٹل یونین کے قوانین کے مطابق رُکن ممالک کو مالی حیثیت کے لحاظ سے آٹھ درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور کوئی بھی رُکن پانچ سالہ کانگریس کے موقع پر اپنا درجہ تبدیل کرنے کی درخواست کرسکتا ہے۔ خدشہ یہ تھا کہ گُذشتہ کانگریس کے موقع پر کئی ممالک اونچے درجے سے نچلے درجے پر آ گئے تھے اور یوں اگر اِس مرتبہ بھی کیا گیا تو تنظیم کے لیے شدید مالی مُشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ اِس مسئلے کا حل ڈھونڈنے کے لئے مختلف ممالک کے مندوبین پر مُشتمل کمیٹی ترتیب دی گئی اور راقم الحروف کو اِسکا صدر مُقرر کر دیا گیا۔ خوش قسمتی سے ہم اِس مسئلے کا حل ڈھونڈ کر رہے۔ اور وہ یوں کہ ہم نے یہ سفارش کر دی کہ آئندہ کے لیے یہ ترمیم کر دی جائے کہ درجہ گھٹانے کی اِجازت کانگریس صِرف

اِنتظامی کونسل کی سفارش پر دیگی اور وہ بھی ایسی صورت میں کہ متعلقہ رُکن مُلک محض ایک درجہ کم تر پر آسکیگا۔یعنی ۵۰ درجے والا مُلک ۴۰ درجے پر تو آ سکتا ہے لیکن سیدھا ۳۰ یا نیچے کے درجے میں نہیں جاسکیگا۔اگلے سال ۲۰۰۳ء میں ہونیوالی اِنتظامی کونسل نے ہماری تجویز سے اِتفاق کیا اور آنے والی کانگریس نے پھر اِس کو من وعَن منظور کرلیا۔یوں ہم تنظیم کو مالی بُحران کے ایک بڑے خطرے سے بچانے میں کامیاب رہے۔

ایک ہی صف میں محمود و ایاز:۔

''سینچر کے دن آپ کیا کر رہے ہیں؟'' بلال خان نے پوچھا۔''اپنے ہوٹل میں مکمل آرام کرنے کا اِرادہ ہے''۔ہم نے جواب دیا۔فرمانے لگے''۔کیا ہی اچھا ہو آپ صبح صبح میرے ساتھ گولف کلب چلیں۔جو بَرن سے کچھ ہی فاصلے پر فرانسیسی بولنے والوں کے علاقے میں واقع ہے۔بہت دن سے میرا وہاں جانے کو موڈ نہیں بن رہا۔اور آپ کی بھابی مجھے روز مزید موٹا ہونے کا طعنہ دے رہی ہیں۔آپ کا ساتھ رہیگا تو ذرا گپ شپ لگتی رہیگی''۔مئی کا مہینہ ہو۔سوئٹزر لینڈ میں تعطیل کی وجہ سے فراغت کا دِن مُیسر ہو اور بلال صاحب جیسی معصوم شخصیت آپکو اپنی پیاری سی آرام دِہ گاڑی میں یہاں کے اِنتہائی خوبصورت مَنظر نامے والی شاہراہ پر گھومنے کی دعوت دے رہی ہو۔اِس سے بہتر ایک اکیلے مُسافر کو اور کیا چاہئے؟ ہم نے فوراً ہاں کردی۔

تعطیل کے روز جب سڑکیں مُقابلتاً ٹریفک سے پاک ہوں۔ساری مخلوقِ خدا ہفتہ بھر کی تھکان دُور کرنے کی خاطر اپنے آرام دِہ بستروں سے چمٹے رہنے کو ترجیح دے۔ایسی صورت میں صبح کے نو بجے بھی علی الصباح ہی گردانے جاتے ہیں۔ ہوٹل سے باہر نکلے تو خنکی خاصی تھی۔بہرحال ہم نے اپنا اوورکوٹ تن ڈھانپنے اور ہاتھ میں چھتری بارانِ رحمت کے قطروں سے اپنے سر کے چند ایک بالوں کو بچانے کے لیے اُٹھا رکھی تھی۔بلال کے تو بال کبھی کے اُنہیں داغِ مُفارقت دے چکے تھے لہٰذا وہ تو ایک موٹی سی ٹوپی سے سر ڈھانپے ہوئے تھا۔کوئی گھنٹہ بھر ہم خوبصورت مرغزاروں،اور شاداب کھیتوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی بَل کھاتی شاہراہ کے مناظر سے لُطف اندوز ہوتے رہے۔بلال ہمیں بتانے لگے کہ برن کے گولف کلب کی تو اُنہیں رُکنیت نہ مل سکی کیونکہ وہاں اُمیدواروں کا رَش کافی ہے۔اِس لیے اُنہوں نے اِتنی دُور جانے میں بہتری سمجھی ہے۔ ویسے جان لیوی (یو۔پی۔یو کے سربراہ) بھی اُسی کلب کا رُکن ہے۔اور اکثر اُس کے ساتھ ٹرف پر کھیلتا رہتا ہے۔یوں ہمیں اُس کے اِتنی دور کھیلنے کی خاطر جانے کی سمجھ آ گئی لیکن ہمیں اِس سے کیا؟۔ہماری سیر تو اپنی جگہ خوب ہو رہی تھی۔

کلب کی پارکنگ میں پہنچے تو پیچھے سے بلال والی کار جیسی ایک اور گاڑی بھی ساتھ آ کر رُکی جس سے ایک اکیلے بُزرگ برآمد ہوئے۔کلب کے کاؤنٹر پر پہنچے تو بلال پہلے سے موجود مُختصر سی قطار میں لگ گئے اور ہم مُلحقہ دیوار پر لگی ہوئی پینٹنگز دیکھنے لگے۔اِتنے میں بلال سے آگے کھڑے ایک صاحب نے بلال سے کچھ کہا جس پر اُنہوں نے پیچھے دیکھا اور مُسکرائے۔ بلال کاؤنٹر سے اپنی اَلماری کی چابی لے کر ہمارے پاس آئے تو ہم نے پوچھا۔''آپکی اپنے سے آگے والے شخص سے کیا گُفتگو

ہوئی جس پر آپ مُسکرائے؟''۔فرمانے لگے۔''ارے وہ پُرانا ساتھی ہے۔مُجھے بتا رہا تھا کہ تمہاری پُشت پر سوئس جمہوریہ کے صدر کھڑے ہیں''۔''واہ بھئی! وہ تو وہی شخص تھا جس نے ہمارے ساتھ ہی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کی تھی۔ بالکل اکیلا تھا۔نہ یوں پاں کرتے ہوئے آگے پیچھے اُس کے سائرن بج رہے تھے۔ نہ حِفاظتی دستے کی بیشُمار گاڑیاں تھیں۔ یہ کیسا صدر ہے؟ اِسے اپنی جان کا کوئی خطرہ نہیں؟''۔ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔''ہمارے ہاں تو اس قسم کی مخلوق کے لیے تین تین یک رنگی گاڑیاں ہوتی ہیں کہ کوئی پہچان نہ سکے اور ہر ایک پر سبز ہلالی پرچم لہرا رہا ہوتا ہے اور آگے پیچھے موٹر سائیکل سوار دَستے اُس مخلوق کی شان کو دوبالا کرنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں''۔جواب میں بلال حسبِ معمول مُسکرا دیا۔حضرت اِقبالؒ نے تو خُدا کے کچھ اور بندوں کے مُتعلق فرمایا تھا لیکن یہاں تو معلوم ہوتا تھا اِقبال صاحب اِسی منظر کو بیان کر رہے تھے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بلال نے ہمیں بعد میں بتایا کہ یہاں کے صدرِ جمہوریہ اُنکی اِنتظامی کونسل کے سات مُنتخب اراکین میں سے ہوتا ہے اور ہر رُکن محض ایک سال تک صدرِ جمہوریہ یا صدرِ سوئس کنفیڈریشن کے طور پر خِدمات انجام دیتا ہے۔نہ تو وہ ہمارے ہاں کی طرح دُرِ نایاب ہوتا ہے اور نہ ہی وہ کُرسی سے ہمیشہ کے لیے چمٹے رہنے کی آرزو لئے ہوتا ہے۔

سوئٹزرلینڈ میں پاکستانی ضیافتیں:۔

دورانِ سفر وطن کی ہر چیز کی اصل قدر معلوم ہو جاتی ہے۔بیگم بلال تو پاکستانی کھانے پکانے میں یدِ طولیٰ رکھتی تھیں۔ جب بھی بلال صاحب یاد فرماتے تو یقیناً خوشی ہوتی۔اُن کے ہاں جا کر ٹیلی وژن پر پاکستانی چینلوں سے اپنے گھر کی طرف گویا کھِڑکی کُھل جاتی تھی اور کچھ دیر تک یہ یاد ہی نہ رہتا کہ ہم وطن سے دور بیٹھے ہیں۔شروع میں تو بَرن میں سفیرِ پاکستان ہمارے اپنے بیچ کے ساتھی جنابِ طیّب صدیقی تھے۔وہ بُلاتے تو اکثر اُس شہر میں مُقیم چند اور ممالک کے سفارت کاروں کو بھی مدعو کر لیتے اور یوں ہمیں اپنے مُلکی حالات دوسروں کی نظر سے دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ بعد میں مُحترمہ فوزیہ وہاب آئیں تو وہ بھی بڑی قدر افزائی فرماتیں۔کبھی کبھی اُن کا ڈرائیور لینے آتا تو وہ پشتو میں بات کرتا اور اپنے شہر پشاور کو یاد کرتا۔اوم پرکاش ہندو تھا لیکن اپنے وطن سے اور وہاں کے باسیوں سے بڑی محبت کرتا تھا اِسی لیے سفیر صاحبہ کے سارے پاکستانی مہمان اُسے پسند کرتے تھے۔

ایک دِن آغا صاحب نے بتایا کہ حبیب بینک قائم کرنے والے خاندان کے سوئٹزرلینڈ میں رہنے والے ایک چشم و چراغ نے ہمیں اپنے گھر ایک خصوصی ضیافت پر مدعو کیا ہے۔حبیب صاحب زیورچ کے نواح میں دیہی علاقے میں ایک پُر آسائش وِلاّ میں رہتے تھے اور یہاں کے ایک اہم بینک ''بینک اَلحبیب زیورچ'' کے مالک تھے۔اُنہوں نے ہمیں لینے کے لئے اپنے ہاں سے اپنی کُشادہ مَرسیڈیز کار بھیجی۔ہم ڈرائیور سے اُردو میں بات کرنے لگے تو اُسنے بتایا کہ وہ تو اطالوی ہے اور حبیب

صاحب کی ساتھ مُدتوں سے خِدمات انجام دے رہا ہے۔ وہی ہم سب کو بالی جوتوں کے کارخانے میں بھی لے گیا۔ جو اِسی راہ میں پڑتا تھا۔ وہاں سے ہم لوگوں نے اپنے پسند کے کچھ جوڑے بھی خریدے۔ حبیب صاحب کے بود و باش تو سوئس شرفاء کے ہم دوش تھی۔ لیکن اُنہیں اپنے وطن کے باسیوں سے خاصی شکائتیں تھیں۔ خاص کر مرحوم ذوالفقار علی بھٹو، جن کو ایک وقت تک وہ اپنا دوست سمجھتے رہے، کی بے رُخی اور مظالم کی داستان وہ سُناتے نہ تھکتے تھے۔ بھٹو صاحب نے اپنے دورِ حکومت میں بہت کچھ قومیالیا تھا اور حبیب خاندان جنہوں نے قیامِ پاکستان کی خاطر بڑی ناقابلِ فراموش خِدمات اَنجام دی تھیں، کو تو اُنھوں نے بالکل کنگال کر کے رکھ دیا تھا اور بقولِ حبیب صاحب کے نہ صرف اُنہیں ٹکے ٹکے کا مُحتاج کر دیا بلکہ اپنا مُلک بھی اُن پر تنگ کر دیا تھا۔ بہر حال اُنہوں نے ہمت نہ ہاری اور کسی طرح دولت کی ریل پیل والے اِس مُلک میں آ کر اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت اپنے نوزائیدہ ادارے کو سوئٹزرلینڈ کیا یورپ کا ایک قابلِ احترام بینک بنا دیا۔ حبیب صاحب نہ صرف اپنی ذات میں ایک اِدارہ تھے بلکہ تحریکِ آزادی اور مالیاتی امور پر اُن کی دسترس بڑی ہی مُتاثر کُن تھی۔

عالمی تجارتی ادارے (WTO) کے صدر دفتر میں پاکستانی سفیر ڈاکٹر منظور نے تو حد کر دی جب اُنھوں نے ازراہ کرم ہمیں جنیوا طلب کر لیا۔ ڈاکٹر صاحب ہمارے یونیورسٹی کے دنوں کے ساتھی تھے۔ علم طبقات الارض میں ڈاکٹوریٹ کرنے کے بعد وہ پاکستان کسٹمز میں منتخب ہو گئے۔ برسلز (بیلجیم) میں ورلڈ کسٹمز ارگنائزیشن میں خدمات انجام دیتے رہے اور پھر حکومتِ پاکستان نے اُنہیں یہاں بھیج دیا تھا۔ اُن کے خلوص کا اِظہار کچھ ایسا تھا کہ ہم اِنکار نہ کر سکے۔ ہم نے بتایا کہ ہم آئیں گے ہمارے ساتھ تو تین اور ساتھی بھی ہوں گے۔ فرمانے لگے ''اُن سب کو لے کر آئیں۔ مُجھے اُن سے مل کر بڑی خوشی ہوگی''۔ معلوم ہوا ایک روز پیشتر وہ ایک خاصے بڑے پاکستانی وفد کی میزبانی کر چکے تھے جو پاکستان ٹیلی کمونیکیشن کے وزیر صاحب کی سربراہی میں جنیوا آیا ہوا تھا۔ بلال صاحب نے ہمیں آغا صاحب اور سلطان محمد کے ہمراہ جنیوا لے جانے کی حامی بھر لی۔ ڈاکٹر منظور صاحب اُس وقت تک جنیوا شہر کے نواح میں ایک خوبصورت سا مکان حاصل کر چکے تھے۔ جو اُن سے پہلے کسی امریکن کی ملکیت تھا۔ وہ یہ پُر فضاء مکان بڑے فخر سے اپنے ہر مہمان کو دِکھلاتے جاتے تھے۔ رہیں بھابی جان تو وہ بے چاری اپنے مہمان نواز میاں کے دوستوں کے لیے مختلف النوع کھانے بنا کر اور میز پر سجا کر اُن کی خوشنودی حاصل کرنے کی فِکر میں لگی رہتیں۔

برطانیہ رُبع صدی بعد:۔

فروری ۲۰۰۷ء میں اِدھر ہماری عالمی تنظیم ڈاک کی مَشاورتی کونسل کا جلسہ اِختتام کو پہنچا اور اُدھر آغا صاحب نے فرمائش کر دی کہ ہم برطانیہ کے شہر رگبی کے قریب واقع اپنا پُرانا مادرِ علمی ''پوسٹل مینجمنٹ کالج'' اُنکو دکھائیں۔ دراصل اُنہوں اِسلام آباد میں اپنے پوسٹل سٹاف کالج کی دومنزلہ عمارت کو سہ منزلہ کرنا شروع کر دیا تھا اور اب وہ برطانوی تجربے سے مُستفید ہونا چاہتے تھے۔ اِس اچانک فرمائش پر ہم نے اُنہیں بتایا کہ ہمارے پاس تو برطانیہ کا ویزا نہیں ہے۔ فرمانے لگے۔ ''آپ نے

لینے کی کوشش نہیں کی ہوگی''۔بلال کو جو ہم نے آغا صاحب کی خواہش سے آگاہ کیا تو کہنے لگے''آپ برطانوی وفد کے قائد سے بات کرلیں، میں پوسٹل کالج رنگی فون کر کے آپ لوگوں کے لیے وقت لے لیتا ہوں''۔ہم نے اپنے برطانوی رفیق کار سے کہا تو تھوڑی دیر میں وہ برطانیہ سے جوابی ای میل کی کاپی لے کر آ گیا۔لکھا تھا کہ ہم اپنا پاسپورٹ جنیوا میں واقع برطانوی سفارت خانے کو بھجوا دیں۔وہ وہاں سے فوراً ہمیں ویزہ دے دیں گے۔اب جینوا کون جائے؟بلال صاحب کا مشورہ یہ آیا کہ ہم سفیرِ پاکستان سے پشتو میں بات کرلیں وہ کسی کو وہاں روانہ کر دیں گی۔اور جھٹ سے اُنہوں نے اپنے فون سے سفارت خانے کا نمبر مِلا کر ہمارے حوالے کر دیا۔محترمہ سفیر صاحبہ سے جب ہم نے برطانیہ جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو فرمانے لگیں۔''شاہ صاحب۔وہاں کا ویزا مِلنا تو بڑا مشکل کام دکھائی دیتا ہے۔ہم خود بڑے دِنوں سے اپنی بہن کے لیے کوشش کر رہے ہیں لیکن نتیجہ''صفر''۔''لیکن ہمیں تو اُنہوں نے تحریراً بتا دیا ہے کہ ہمارے پاسپورٹ پر فوراً ویزہ لگا دیا جائیگا''۔ہم نے کہا۔سفیر صاحبہ کا اِشتیاق بڑھا۔فرمانے لگیں۔''آپ مجھے یہ ای۔میل فیکس کر دیں۔ویسے میں کِسی کو آپ کے پاس پاسپورٹ لینے بھیج رہی ہوں''۔غرض ہمارا پاسپورٹ بمعہ چھ ماہ کے لیے برطانوی ویزہ کے ہمارے پاس پُہنچا تو ہم نے اپنے بھانجے ڈاکٹر یاسر کو فون کر دیا جو اُس وقت برطانیہ کے شہر''لِنکن''میں کام کر رہا تھا۔وہ ہمارے اِس اچانک پروگرام سے بڑا خوش ہوا۔کہنے لگا۔''آپکو معلوم ہے نوید بھی پرسوں ترسوں یہاں آ رہا ہے۔اُسے لینے میں لندن آ ہی رہا ہوں تو آپکا بھی ہیتھرو ایئر پورٹ پر اِستقبال کرلوں گا''۔اپنے بیٹے نوید کے کے مُتعلق ہمیں اِتنا تو ضرور معلوم تھا کہ وہ اپنی تعلیم کے سلسلے میں برطانیہ کی کِسی یونیورسٹی میں داخلے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اُسکا یوں اچانک آنا ہمارے عِلم میں نہیں تھا۔یوں آغا صاحب اور ہم لندن ہیتھرو پہنچے تو یاسر صاحب آگے سے موجود تھے۔وہ اور ہم ایئر پورٹ سے نکلے تو برابر ہی واقع ریلوے سٹیشن میں داخل ہوگئے۔''واہ بھئی۔یہ ہیتھرو ریل کیسے آ گئی۔رُبع صدی پہلے ایسی کوئی بات نہیں تھی''ہمارے مُنہ سے بات نِکلی۔''ماموں آگے آگے دیکھئے۔کیا کچھ نہیں بدلا؟''یاسر ہمارا سامان ریل کے ڈبے میں جلدی سے رکھتے ہوئے بولا۔دو ٹکٹ تو وہ پہلے ہی خرید چُکا تھا۔

لندن کی زیرِ زمین چلنے والی مشہورِ زمانہ ریل سَر پٹ دوڑے جا رہی تھی۔ہر چند منٹ بعد کوئی نہ کوئی سٹیشن آتا رہا۔مُسافر اُترتے بھی رہے اور ڈبوں میں چڑھتے بھی رہے۔بیسویں صدی کی اوّلین دہائیوں میں بننے والا یہ آرام دِہ نظام گذشتہ بچیس برس میں مزید پُرانا ہو چکا تھا لیکن مجال ہے اِسکی سہولیات میں کوئی بھی فرق پڑا ہو۔اچانک یاسر نے میرا بھاری بھرکم بکسا اُٹھایا اور کہنے لگا۔''چلیں ماموں جان''۔''کہاں اُتار رہے ہو؟''ہم نے کہا۔بولا''اُترنے کے بعد سینکڑوں میٹر اوپر چڑھنا ہے''۔ہم اُس کے پیچھے ہو لئے۔پلیٹ فارم سے ہم برقی خود کار چڑھتی ہوئی سیڑھیوں کے ذریعے آپ ہی آپ اوپر جا رہے تھے۔ہماری طرح ہزاروں لوگ مرد و زن اور بچے ایک سیلِ رواں کی طرح تیزی سے مختلف سمتوں میں رواں دواں تھے۔کچھ ہی دیر میں ہم مصنوعی روشنیوں سے نِکل کر کُھلے آسمان تلے آ گئے تھے۔''یہ تو پکاڈلی ہے۔یہاں کیا کرنا ہے؟''ہم نے پوچھا۔کہنے لگا''ماموں تھوڑی دیر کے لیے لندن کو سُونگھ لیتے ہیں۔میں بھی بڑے دِنوں بعد آیا ہوں''۔پکاڈلی سرکس کو

آپ لندن کا دِل سمجھ سکتے ہیں۔ یہ مرکزِ شہر ہے۔قدیم اورانتہائی پُر رونق۔آپ کے اِردگرد کئی مشہورومعروف قدیم عمارتیں سینکڑوں برس کی کھڑی آپ کو دعوتِ نظارہ دے رہی ہیں۔نیلسن کالم۔ٹرافالگرسکوائر۔لندن میونسپل کارپوریشن کی بلڈنگ اور خدا جانے کیا کیا! مخلوقِ خُدا کا رَش تو یہاں ہر لمحے نظر آتا ہے لیکن مجھے تو آج کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا گویا یہ سب لوگ مُختلف رنگ ونسل سے متعلق محض میرا اِستقبال کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے تھے۔کچھ لوگ موسیقی کی دُھنیں بجانے میں مصروف تھے اور کچھ مختلف قسم کی پینٹنگز لئے ایک فوارے کے گرد نمائش کے لیے پیش کر رہے تھے۔لندن کی مشہورِ زمانہ لال رنگ کی ڈبل ڈیکر بسیں اور کیڈالک ٹیکسی کاریں اِس مرکز سے نِکلتی ہوئی مُختلف سڑکوں پر دوڑتی نظر آرہی تھیں۔اکا دُکا لندن میٹروپولیٹین کا پولیس مین (بوبی) اپنی مخصوص یونی فارم میں ملبوس دِکھائی دے رہا تھا۔سچ ہے''لاہور لاہور ہے لیکن لندن لندن ہے!''۔ ہمارے لَب گویا ہوئے۔تھوڑی دیر مرکزِ شہر کی ہوا کھانے کے بعد یاسر کی سرکردگی میں ہم ایک ڈبل ڈیکر بس میں سوار ہوگئے۔''یہ کِدھر لے جائیگی؟'' ہم نے پوچھا، جواب آیا۔''کہیں بھی نہیں۔بس تھوڑا سا اِس میں بھی گھوم لیتے ہیں تاکہ لندن کی مصروف ترین گلیوں کا منظر دیکھ لیں۔پال مال پر نظر پڑی وہی، ہزاروں لوگوں کا رَش۔بڑے مُنظّم انداز میں اچھے خاصے سرپھروں کی طرح تیز تیز قدموں سے سڑکیں ناپتے نظر آرہے تھے۔ہم بس پر بھی اور اُسکے بعد ٹیوب پر دوبارہ سوار ہوتے ہوئے مختلف احتیاطی تدابیر کا خیال رکھتے ہوئے اہالیانِ لندن کی حفاظتِ جان و مال کے حوالے سے پریشانی محسوس کر رہے تھے۔رُبع صدی پہلے تو خطرے کا مرکز کافی قریب تھا۔اکثر آئرش ری پبلکن آرمی (آئی۔آر۔اے) کی جانب سے چھوٹے موٹے بم رکھ کر فِضا میں اِرتعاش پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔آج کے دہشت گرد تو سات سمندر پار سے تربیت حاصل کر کے مُوجبِ اِنتشارِ معاشرہ ہوتے ہیں۔مغربی حکومتوں کی نظر میں بلا دِمشرق کے خُشک پہاڑوں یا گرم صحراؤں میں بَلا کے ہُنر مند دَہشت گرد پیدا ہوتے ہیں جو جہاز اُڑا کر بُلند و بالا عمارات کو آناً فاناً تباہ کر دیتے ہیں۔یا ریلوے نِظام کو مفلوج کر کے رکھ دیتے ہیں۔وہ بظاہر سادہ لوح مُبَلّغ اچھے اچھے جدید تعلیم یافتہ اَذہان کو بَدل کر رکھ دیتے ہیں۔ایسے خطرناک دُشمن باوجود ہزار جدید ترین حِفاظتی حَصاروں کے اُنہیں توڑ کر مغربی دُنیا کے لیے عظیم خطرہ بنتے ہیں۔لہٰذا ترقی یافتہ اَقوام پیش بندی کے طور پر اپنے جدید اور مُہلک ترین اَسلحہ کا اِستعمال کرتے ہوئے ایسی مخلوق کے مفروضہ ممالک میں جا کر اُن کے مٹی کے گھروندوں کو تاراج کر دینے سے نہیں ہچکچاتے۔ چلئے اَلقاعدہ اور طالبان کے وجود نے آئی۔آر۔اے، ریڈ بریگیڈ۔شِکاگو مافیا۔نازیوں اور رُوسی سُرخ فوج کی یاد کو تو ذہنوں سے محو کر دیا۔

شام کو ہم''ایسٹ فِنچ لے''میں اپنے دوست انجینئر یٰسین سُلنگی کے ہاں پہنچے۔وہ یہاں ایم۔فِل کرنے کے سلسلے میں ایک مشہور ٹیکنیکل یونیورسٹی کا طالبِ علم تھا اور اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ یونیورسٹی کی جانب سے مہیا کردہ مکان میں رہائش پذیر تھا۔ اُسکے اڑوس پڑوس میں سب ایسے ہی اعلیٰ درجوں کے جویانِ علم اپنے اپنے کُنبوں کے ہمراہ آباد تھے۔کوئی مصر سے کوئی امریکہ

سے تو کوئی ہندوستان یا انڈونیشیا سے تعلق رکھتا تھا۔ایک اچھی خاصی اَقوامِ متحدہ یہاں آباد تھی۔ہم ایک دو روز سُلنگی صاحب کی میزبانی سے مُستفید ہوتے رہے۔نوید پہنچا تو ہم پھر ایک دفعہ برطانوی ریلوے کے مُسافر بنے اور لِنکن کے خوبصورت شہر پہنچے۔

ڈاکٹر صاحب شہر کے کاؤنٹی ہسپتال میں خدمتِ خلق انجام دے رہے تھے۔ برابر میں اُنکی رہائش گاہ تھی۔ ابھی اکیلے تھے لہٰذا ہم مُکمل آرام وسکون اور خاطرِ جمعی سے لِنکن کا حدود اَربعہ معلوم کرتے رہے۔ یہ چھوٹا سا اِنتہائی پُر سکون اور حسین وجمیل شہر لِنکا شائر کاؤنٹی کا صدر مقام ہے۔ اِس کی شُہرت کے لئے یہاں کے مشہور ومعروف کلیسا سے واقفیت ضروری ہے جو اپنی وسعت اور قدامت میں یورپ کی چند اہم ترین مذہبی عمارات میں شُمار ہوتا ہے۔شہر کی آبادی تو کافی زیرین سطح پر واقع ہے۔ یہ گرجا گھر البتہ ایک پہاڑی پر بنا ہوا شہری آبادی کے سر پر تاج کے مانِند اپنی رونقیں بکھیرتا معلوم ہوتا ہے۔ اِسکی تعمیر میں استعمال ہونے والی کاریگری جِناتی ہاتھوں کا کرشمہ نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اِنگلستان کا اِبتدائی آئین جسے ''میگنا کارٹا'' کہتے ہیں۔(یہ وہ معاہدہ تھا جو انگریز شُرفاء اور بادشاہ وقت کے درمیان طے ہوا تھا)۔اُس کی اصل کاپی یہاں کے قلعے میں ۱۲۱۵ء سے موجود ہے۔ویسے دانشورانِ علمِ سیاسیات برطانوی آئین کو غیر تحریری کہتے ہیں اور یہ اسی قسم کی ٹکڑیوں پر مُشتمل بتایا جاتا ہے۔

کاؤنٹی ہسپتال گرجا گھر کے قریب اِسی بُلندی پر واقع ہے۔ہسپتال کے پہلو میں نیچے کی طرف ڈھلوان میں ایک وسیع وعریض عوامی پارک ہر کسی دیکھنے والے کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔ شام کو ڈاکٹر صاحب اکثر رات کی ڈیوٹی پر چلے جاتے۔صبح آتے تو اپنے مریضوں کے دِلچسپ لطیفے سُناتے۔اُن کے مریض بڑی تعداد میں شراب کے رسیا مدہوش بلکہ بے ہوش حال میں پولیس پکڑ کر لاتی۔رات بھر آرام کے بعد صبح اُنہیں اپنے اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا۔اِس قسم کی حرکت وہاں کوئی خاص بُرائی نہیں سمجھی جاتی جب تک اُن کی کوئی حرکت کسی بڑی پریشانی کا موجِب نہیں بنتی۔بہرحال انگریزی معاشرہ اِس اُمُ الخبائث کے ہاتھوں خاصا پریشان ہے لیکن کیا کیا جائے ؎ بنتی نہیں ہے بادہ،ساغر کہے بغیر

اور رہے ڈاکٹر صاحب تو وہ تو یہ شعر گنگناتے رہتے۔ ؎

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو تب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

ڈھائی ماہ بعد پھر سوئٹزرلینڈ جانا پڑا۔ اِس دفعہ ہمیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ سوئس ایئر لائن کراچی سے زیورچ کے ٹکٹ ہی میں آپ کو لندن بھی لے جاتی ہے۔لہٰذا ہم نے ایسا ہی پروگرام بنایا۔ زیورچ ایرپورٹ سے جانے لگے تو معلوم ہوا کہ آغا صاحب کے برطانوی ویزے میں محض تین دِن مزید باقی ہیں۔ جہاز کے عملے نے اعتراض کیا تو ہم نے اُنہیں جھٹ سے آغا صاحب کا واپسی ٹکٹ دکھایا جس کے مطابق اُنہوں نے ٹھیک تیسرے دِن لوٹ آنا تھا۔تب اُنہیں جانے دیا گیا۔ ہمارا مسئلہ یہ تھا کہ ہمیں ہمارے دوست یٰسین سُلنگی نے لینے آنا تھا۔اُنہیں وہاں نہ پا کر ہم نے اپنے طور پر شہر کی جانب چلنے کی کوشش کی۔آخر ڈھائی ماہ پہلے ہم اُن کے ہاں گئے تو تھے لیکن اُس

وقت تو ڈاکٹر یاسر ہماری اُنگلی پکڑ کے لے جا رہے تھے۔

ٹیوب سٹیشن میں داخل ہوئے تو ہمارے اَوسان خطا تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ایک بوڑھا ہنس مُکھ انگریز ایک خاص وضع کا لباس پہنے ہر گُم گشتہ راہ کی راہبری فرما رہے ہیں۔ ہم نے بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی اُن کی مدد چاہی۔ وہ فرمانے لگے ''کیا آپ پہلی دفعہ لندن آ رہے ہیں؟'' ہم نے حقیقت حال بتاتے ہوئے کہا ''ہم جب یہاں رہتے تھے اُس زمانے کو پورے پچیس برس ہو گئے ہیں۔ اب تو ہماری نظر بھی خاصی کمزور ہو گئی ہے''۔ اُس نے خالص انگریزی محاورہ استعمال کرتے ہوئے بَرجستہ جواب دیا ''اوہ! پُل کے نیچے ابتک کافی پانی بہہ چُکا ہے۔ اب تو کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور سیلولر فونز کا زمانہ آ گیا ہے۔ بہر حال آپ قطعاً پریشان نہ ہوں''۔ اُس نے اپنی ایک جیب سے لندن کی بس سروس کا اور دوسرے سے ٹیوب سسٹم کے نقشے نکال کر ہمیں تھما دیئے اور فرمانے لگے۔ اِس سامنے لگے ہوئے چارٹ پر اپنی منزل کی نشان دہی کر لیں اور دیئے ہوئے زون کے کرایے کے مطابق ساتھ لگے ہوئے مشین سے ٹکٹ خرید لیں''۔ لیجیے اِس خضر سیرت اِنسان نے ہماری مُشکل آسان کر دی۔ ٹرین میں بیٹھے تو ہوش ٹھکانے لگتے محسوس ہوئے لیکن بدقسمتی سے مُسافروں کے ہجوم کی وجہ سے ہم اُس سٹیشن سے آگے نکل گئے جہاں سے دوسری لائن کی ٹرین لینی تھی۔ ایک نوجوان گورے سے پوچھا۔ کہنے لگا۔ ''کوئی بات نہیں۔ اگلے سٹاپ پر اُتر کر مخالف سمت میں آنیوالی ٹرین میں بیٹھ جائیں۔ آپ صرف ایک سٹاپ ہی آگے آئے ہیں''۔

غرض ایک جہاندیدہ سیاح کی طرح پوچھتے پاچھتے ہم یٰسین صاحب کی رہائش گاہ پر ''ایسٹ فنچ لے'' پہنچ ہی گئے لیکن وہ وہاں سے غائب تھے۔ اُنہیں فون کیا تو پتہ چلا حضرت ہمیں لینے نکلے تو ہیں لیکن بدقسمتی سے اُلٹی سمت میں جانے والی ٹرین میں سوار ہو گئے تھے۔ یہ اُس انتہائی ذہین انسان کی خود فراموشی تھی جو ہر بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحان میں ٹاپ پوزیشن حاصل کرتا رہا تھا۔ اور انجینئرنگ کالج میں تو اُسکے چار سالوں کے اوسط نمبر 96.6 فی صد تھے۔ لیکن ایسے سب ذہین اَذہان ہمارے دیس سے چھن جاتے ہیں۔

شام کو لنکن سے نوید کا فون آیا کہنے لگا۔ ''ابو۔ آپ اِس دفعہ لنکن آئیں تو بجائے ٹرین کے لندن سے یہاں کے لیے ڈائرکٹ بس لے لیں تا کہ آپ کو راستے میں ٹرین بدلنے کی ضرورت نہ ہو''۔ واہ بیٹا۔ کیا خوب مشورہ ہے! تم ہماری مُشکل سمجھ گئے ہو۔ لیکن بس کہاں سے لیں۔ لندن تو بہت بڑا شہر ہے؟''۔ ہم بڑبڑائے۔ یٰسین نے جیسے ہمیں سُن لیا۔ کہنے لگا۔ ''اَنکل آیئے ہم آپ کے لیے ٹکٹ لے لیں''۔ ''وہ کیسے؟ کِدھر جانا پڑیگا؟'' ہم نے سوال کیا۔ یٰسین نے اپنا لیپ ٹاپ کھولا۔ لندن ٹرانسپورٹ کا صفحہ نکالا۔ اور پوچھنے لگا۔ ''آپ کتنے بجے والی بس میں جانا پسند کریں گے اور بیمہ کروا کر یا بغیر بیمہ کیے جائیں گے۔ صِرف آدھے پاؤنڈ کا فرق ہے''۔ ''بیٹا بیمہ کروا کے بھجواؤ۔ زندگی صرف ایک ہی دفعہ ملتی ہے۔'' ہم نے جواب دیا۔ اُس نے اگلے لمحے اپنے لیپ ٹاپ کے ساتھ لگے ہوئے پرنٹر سے ایک کاغذ نکالا اور مجھے تھماتے ہوئے بولا۔ ''یہ لیجیے آپکا ٹکٹ ہو گیا۔ میں نے آپکے کریڈٹ کارڈ کا نمبر لکھوا کر پے منٹ بھی کر دی ہے''۔ اِس کے بعد سے تو ہم کسی بس میں

سوار ہوں یا ٹرین کا ٹکٹ لیں یا کسی سٹور سے خریداری کریں۔ بس اپنے کریڈٹ کارڈ سے کام چلا لیتے تھے۔ بھاری بھرکم پاؤنڈ کے سکّے جیب میں رکھنے سے کافی حد تک جان خلاصی ہو گئی۔

بس پر لندن سے لِنکن جانے کا فیصلہ اچھا لگا۔ آرام دِہ بس پر ہم اِنگلستان کے دیہی علاقے کا خوبصورت منظر نامہ مُفت میں دیکھے جا رہے تھے۔ لِنکن پہنچے تو بس سٹاپ پر نوید میاں کانوں کو خُنک ہواؤں کی شِدّت سے بچانے کی کوشش میں موٹے سے مَفلر سے اُنہیں ڈھانپتے ہوئے نظر آئے۔ اور ہماری خوشی بس دیکھنے کی تھی۔

اب کی بار یاسر اکیلا نہیں تھا۔ اُس کے لئے گرم گرم اور مزے مزے کے کھانے پکانے کے لیے رومی اُسکے گھر پہنچ چکی تھی۔ رومی بلکہ ڈاکٹر رومی کنول شادی کے دِن سے ہی یاسر کے ہمراہ برطانیہ بلکہ سارا یورپ دیکھنے کے خواب آنکھوں میں سجّائے بیٹھی تھی۔ اگلے روز یاسر نے اپنے ساتھ کام کرنے والے اپنے جنوبی افریقہ سے آئے ہوئے گوری نسل کے کنسلٹنٹ کو گھر پر کھانے پر بُلایا ہوا تھا۔ ''ماموں آپ بھی اُس سے مل لیں۔ آپ کی معلومات میں کافی اِضافہ ہو گا''۔ کھانے کی میز پر اُس سے ہماری مُلاقات ہوئی تو ہم نے اُسے بتایا کہ یاسر ہمارا بھانجا ہے تو رومی ہماری بھتیجی ہے۔ ''تو کیا یہ تمہاری سگی کزن ہے؟'' اُس نے یاسر سے پوچھا۔ یاسر نے ہاں کہنے کے لیے اپنا سَر ہلایا۔ تو کنسلٹنٹ صاحب فرمانے لگے۔ ''تو تم دونوں ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی آپس میں شادی کرنے پر اتنی قریبی رشتہ داری کے باوجود تیار ہو گئے؟'' ''ہمارے ہاں عموماً ایسا ہی ہوتا ہے''۔ یاسر نے جواب دیا۔ اور ہم کنسلٹنٹ صاحب کے اِس معاملے میں ظاہر کردہ تحفظات کے متعلق سوچنے لگے۔ ''کیا اُنکی یہ سوچ مذہبی اور کلچرل بُنیادوں پر مَبنی ہے یا سائنسی فِکر پر؟''۔

اگلے دِن جمعتہ المبارک تھا۔ یاسر اور نوید ہمیں لے کر گھر سے باہر نکلے اور ایک ٹیکسی والے کو بُلا کر اُس سے کہنے لگے ''ہمیں مُسلِم چرچ میں جانا ہے۔ کیا تم پہنچا دو گے؟''۔ وہ تھوڑا سا پریشان ہو کر اُسکی طرف دیکھنے لگا تو یاسر نے اُسے بتایا کہ شہر سے باہر واقع سٹیڈیم میں جہاں جمعے کے دِن بہت سے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ وہیں لے چلو۔ ٹیکسی والا سمجھ گیا۔ سٹیڈیم پہنچے تو ایک میلے کا سماں تھا۔ مُسلمان مرد اور بچے رنگ برنگ ٹوپیاں پہنے جوتے ہاتھوں میں پکڑے سٹیڈیم کے ایک کونے میں بچھی ہوئی صفوں کی جانب جا رہے تھے اور ایک طرف خواتین سَروں پر دوپٹے اوڑھے سکارف باندھے نظر آ رہی تھیں۔

لندن کے علاقے فنچلے میں لمبی ڈاڑھیوں والے حضرات اپنی کھوپڑیوں پر مُختصر سی ٹوپیاں لگائے نظر آئے۔ یٰسین نے بتایا کہ اُن کے علاقے میں یہودیوں کی اکثریت ہے لیکن ''نارتھ فِنچلے'' میں مُسلمان بھی کافی تعداد میں آباد ہیں۔ اُن کی مسجد دیکھنے کا بھی اِتفاق ہوا جو ماشاءاللہ خاصی آباد تھی۔ محسوس یہی ہوا کہ برطانوی معاشرے میں اَب بھی عام طور سے مذہبی رواداری کی فضا حوصلہ افزا ہے۔